قرآن فہمی کا دیرینہ مخمصہ -

قرآن آسان یا ایک مشکل امتحان

نماز کی مثال

ہم اس آرٹیکل کی ایک ایسے عمل کی مثال دیتے ہوئے ابتدا کرتے ہیں جس کا تمام دنیائے اسلام میں نہایت معروف انداز میں اتباع کیا جاتا ہے اور جسے دین کا ستون قرار دیا اور مانا جاتا ہے۔ ہماری قرآن فہمی کی اصلیت کو جاننے کے لیے یہ ایک ہی نمونہ کافی ہو گا کیونکہ یہ ہماری امّتِ مرحومہ کے مجموعی علم و دانش کو پرکھنے کا ایک سب سے باوثوق اور عالمگیر معیار ہے۔ ہمارا یہ عمل "نماز" کہلاتا ہے اور ایک رسمی پرستش کا عمل ہے۔

ہماری قرآن فہمی کی نہایت پُر فریب کیفیت یہ ہے کہ ہم نے اس الہامی ہدایت کی کتاب اور اس کی تعلیمات کا ست اور نچوڑ اسی رسمِ پرستش کی شکل میں کشید کیا ہے جسے ہم نماز کہتے ہیں۔ حالانکہ پورے قرآن کے طول و عرض میں کہیں بھی کسی پرستش کے عمل کا نہ تو حکم پایا جاتا ہے اور نہ ہی تجویز یا سفارش کی گئی ہے۔ جس عمل کو ہم نماز کہتے اور سمجھتے ہیں وہ قرآنی زبان میں دراصل "صلوۃ" کہلاتا ہے اور اُس کا معنی دور و نزدیک کہیں سے بھی پرستش کی ذیل میں نہیں آتا،،،، بلکہ مستند طور پر، اپنے مادہ کی بنیاد پر، "اتباع" و "پیروی" ہے۔ فرائضِ منصبی کی ادائیگی ہے،،، انتہائی وابستگی اور پیوستگی کے ساتھ پیروی و ادائیگی۔ جب یہ لفظ "ال" کے اضافے سے معرفہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی "الصلوٰۃ" ہو جاتا ہے، تو اس کا معنی "وہ خاص اتباع و پیروی ہو جاتی ہے جو اللہ تعالٰی کے احکامات کو بجا لانے کے لیے کی جائے"۔

نیز جس دیگر لفظ سے ہم نے "پرستش" کا معنی ایجاد و اختراع کر رکھا ہے، قرآن میں وہ لفظ "عبادت" کے نام سے آتا ہے۔ ستم ظریفی دیکھیں کہ عبادت کا لفظ بھی کہیں دُور سے بھی پرستش کا ہم معنی نہیں ہے، بلکہ اس کے باوثوق لغوی معانی میں "اطاعت، بندگی، فرماں برداری، حکم کا بجالانا، وغیرہ آتا ہے۔

پس ہماری قرآن فہمی کا، عالمی سطح پر، جب یہ عالم ہو، تو پھر یہی سفارش کی جاسکتی ہے کہ ،،،،، کیونکہ اس کو سمجھنا ہمارے لیے ناممکن ہے، اس لیے ہم قرآن کا پیچھا چھوڑ ہی دیں تو اچھا ہے ،،،،، اور اُس آنے والے مبارک وقت کا انتظار کریں جب بالآخر ایک مجموعی انقلابی تعلیمی پروگرام پر عمل کرتے ہوئے ہماری آئندہ نسل قومی یا بین المِلّی سطح پر وہ علمی معیار حاصل کرلے کہ صدقِ بسیط سے آگاہی حاصل کرنے کے لائق ہو جائے اور اُس کے لیے ، ایک تحقیقی مزاج حاصل کر لینے کے باوصف، نفس الامر کا ادراک کرنا آسان ہو چکا ہو۔

جہاں تک ہماری اس بڑی مثال کا تعلق ہے، جس سے کہ ہم نے اپنے موضوع کی ابتدا کی ہے، تو اس عاجز کی ناچیز رائے میں نماز ایک ایسا موضوع ہے جس پر بات کرنا ایک انتہائی لایعنی اور فرسودہ رسم کو، یا ایک بے سود معاشرتی رواج کو، فضول کی اہمیت دینا اور اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا ہے۔ ایک کارِ لاحاصل ہے۔ قطعی طور پر خارج از قرآن موضوع ہے۔

علمی بحث اُس موضوع پر کی جاتی ہے جو نتائج کا حامل ہو اور جس کے نتائج کوئی پیداواری کام کرتے نظر آرہے ہوں۔ یا جس سے انسانی خیر کا کوئی سرچشمہ پھوٹتا ہو، اور ظلمات کے اندھیروں میں دُور کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہو۔

چودہ سو سال سے جو عمل اندھی تقلید کے رُو سے مسلسل بے مغزی کے ساتھ کیا جارہا ہو اور اس کے نتیجے میں نہ احترامِ آدمیت اور نہ کوئی انسانی منفعت دیکھنے میں آئی ہو، نہ ہی اس میں کردار سازی کا کوئی پہلو پایا جاتا ہو، نہ ہی وہ اس قوم کی کسی بھی شعبے میں کسی ترقی کا آئینہ دار ہو، بھلا ایسے بے سود و بے روح عمل کو کیوں موضوعِ سخن یا موضوعِ تحقیق بنایا جائے اور زیرِ بحث لایا جاتا رہے؟

اگر فالتو وقت میسر ہو تو بہت سے بنیادی موضوعات ایسے ہیں جن کا مطالعہ آپ کو وہ بنیادی بصیرت عطا کر سکتا ہے جو آپ کے ارتقائی عمل میں مدد و معاون ثابت ہو اور آپ کی سوچوں کو وہ صحیح سمت عطا کر دے جو آپ کے خالق کو آپ سے مطلوب ہے۔ آپ مخلوقِ خدا کی دامے، درمے وسخنے مدد کرنے کے قابل ہو جائیں۔

سوچیں اور مطالعہ کریں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ زندگی کیا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے۔ کس طرح یہ ساری کائنات انسان کی تخلیق کے مرحلے تک آپس میں مربوط اور باہمی انحصار اور رفاقت کے رشتوں میں جڑی ایک ہی وحدت ہے۔ انسان کے اندر وہ کونسے عناصر ہیں جو بدی اور نیکی یا شر اور خیر کے جذبات کے محرک ہوتے ہیں۔ انسان کیوں نظاموں کی تلاش میں پیہم سرگرداں ہے۔ کیا وہ موروثی طور پر آئیڈیل کی تلاش کے محرکات لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کیا تخلیق کے اندر خود خالق کی روح موجود نہیں ہوتی، یا اُس کی خوبیاں اور اوصاف نہیں پائے جاتے ؟ کیا اپنے اندر ڈوب کر اپنے خالق کی انہی صفات کو تلاش نہیں کیا جاسکتا اور ان کی نمود سے اپنی ذات کی تکمیل نہیں کی جاسکتی ؟ کیا ایک حقیقی اور سچے آئیڈیل کی جستجو کیے بغیر اور اسے پا لینے سے محروم رہ کر انسان کبھی بھی روحانی سکون و اطمینان اور ایک انتہائی سرخوشی اور انبساط کی بلند کیفیت حاصل کر سکتا ہے ؟ کیا سیرت و کردار کے اعلیٰ معیار حاصل کے بغیر انسان اپنے ساتھی انسانوں کے دکھوں، محرومیوں اور کمزوریوں کا مداوا کر سکتا ہے ؟

قرآن قرآن قرآن کی رٹ لگانا اب چھوڑ دیں۔

دنیا میں صرف ایک چوتھائی تعداد میں وہ انسان ہیں جو قرآن کو مانتے ہیں- وہ بھی جانتے بالکل نہیں۔ اور وہ بھی سب سے گھٹیا اور کمتر معاشرتی درجے،،، اور کم ترین ترقی یافتہ انسانوں،،،، کی ذیل میں آتے ہیں۔۔۔ یوں بھی جب ہم خود انسان ہی کو، یا انسانی زندگی ہی کو اب تک نہیں جانتے کہ کیا ہے اور کس طرح اپنے وظائف ادا (فنکشن) کرتی ہے، اس کے تقاضے کیا ہوتے ہیں، اس کے اندرون کیا کشمکش پیہم رواں ہے ؟،،،، تو اس سے آگے بڑھ کر اس سے متعلق کسی نظریے کو یا فلسفے کو درست انداز میں کیوں کر جان سکیں گے ؟۔ جب ہماری گاڑی صحیح پٹڑی پر ہی نہیں چڑھ پائی تو ہمارا قافلہ منزل کی سمت کیسے چل پائے گا خواہِ ہدایت نامہِ سفر ہمارے ہاتھوں ہی میں کیوں نہ ہو ؟ ذیلی معاملات میں سارا وقت ضائع کرنے کا کیا جواز ہے جب کہ پہلے اپنی اصل و بنیاد کا علم تو ہمارے پاس موجود ہی نہ ہو ؟۔ نظریات اور فلسفے اور نظامہائے حیات تو بہت بعد کے سوالات ہیں۔ اسی لیے تو خالق نے فرمایا کہ قرآن کو صرف اولی الباب، اصحابِ علم و شعور و تفکر اور اصحابِ تفقہ و تدبر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ کیا ہم سب نے خود کو خواہ مخواہ ہی خالق کے اس حتمی طور پر متعین کردہ درجے پر فائز کر لیا ہے اور اُس کی کتاب کے ساتھ کھلواڑ کا حق حاصل کر لیا ہے ؟

آخر دنیا میں رہنے والے دیگر تین چوتھائی انسان جو قرآن کو نہیں جانتے،،،، مسلمان نہیں کہلاتے،،،، وہ کیسے ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں، اور ان میں ایسے لوگ کیسے پیدا ہو گئے جو عظیم نیکیاں بھی کر رہے ہیں اور انسانی خیر کے لیے اپنی دولتیں بھی وقف کرتے رہتے ہیں۔ فرعون اور قارون اُن میں بھی موجود ہیں۔ لیکن قرآن کو بالکل نہ جاننے والوں میں،،، اور اسے صرف زبانی ماننے والوں میں تو سارے کے سارے ہی فرعون ہیں۔ یعنی ہمارے تو قارون و ہامان بھی سب فرعون ہیں۔

مودبانہ مشورہ ہے کہ انسانیت کے ارتقاء کا وہ راستہ تلاش کریں جو خود انسان کی شعوری ذات کے اندر ودیعت کردہ اور ثبت شدہ حالت میں موجود پایا جاتا ہے۔ جسے ہم میں سے ہی کچھ لوگ تلاش کر بھی لیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت بہت ہی کم لوگ ہیں جو خالق کے مقرر کردہ پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ یہ بھی عموماً گمنام لوگ ہیں جنہیں ہم آپ جان ہی نہیں پاتے۔ بحث مباحثوں میں لاکھوں صفحات سیاہ کرتے چلے جائیں، قرآن کو زبانی ماننے والوں میں صرف "میں نہ مانوں" والا وہ قبیلہ ہی پایا جاتا ہے جو اپنی اصل میں خود اپنی ذات کے بنیادی علم سے بھی محروم ہے۔ اور جو انسانیت کی تضحیک پر تلا کھڑا ہے ۔

خدارا قرآن کا پیچھا چھوڑ دیجیئے،،،، جب تک کہ کوششِ پیہم سے خود کو اس درجے کے لائق نہ کر لیں جو خود قرآن کے مخاطب نے اس کی تفہیم کے لیے مقرر و متعین فرما دیا ہے !!!!!!!! ہم بحیثیتِ قوم اُس درجے سے بہت پیچھے ہیں ۔

قرآن کے "آسان" ہونے کا بے بنیاد ڈھونگ

ہم عاجزوں کے منہ پر ہمارے خود ساختہ "علمائے قرآن" عموماً ایک آیت بے ساختہ مار دیا کرتے ہیں۔ وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ قرآن تو ہر ایک کے سمجھنے کے لیے "آسان" کر دیا گیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو، اور کہاں سے یہ قرار داد لے کر آئے ہو کہ قرآن سمجھنا آسان نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ وہ آیتِ مبارکہ ڈسکس کی جائے، کیوں نہ اپنی عقل و شعور کو پہلے ,,, ایک زوردار چانٹا ,,, خود اپنے ہی ہاتھ سے رسید کیا جائے ،،، ,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,,, , تا کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے اور شاید متحرک ہو کر کام کرنے لگ جائے۔۔۔۔ وہ یہ سوچنے پر آمادہ ہو جائے کہ اگر واقعی قرآن فہمی "آسان" ہوتی، تو آج چودہ سو سال تک اسی میدان میں آبلہ پائی کرنے،، اور مسلسل کرتے رہنے،،، کے باوجود آخر کیوں اب تک "ہنوز دلّی دُور است" والا معاملہ درپیش ہے ؟؟؟

آخر کیوں آج تک ان گنت محاذ اسی "آسان" موضوع پر خامہ فرسائی کرتے رہنے کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ اور لاکھوں صفحات سیاہ کیے جا رہے ہیں ؟؟؟

اور آخر کیوں، تقریباڈیڑھ ہزار سال بعد بھی،،، قرآن کی تفہیم کے لیے ہر شہر کی ہر چوتھی گلی میں ایک "عالمِ قرآن" بیٹھا،از خود، نہایت نیک نیتی اور اخلاص سے کام لیتے ہوئے، ایک عدد نئی "تفسیرِ قرآن" لکھنے میں اپنی "عظیم صلاحیتیں" مرتکز فرمارہاہے ???

اسی لیے نا کہ،،،،،وہ سابقہ کسی بھی تشریح و تفسیر سے مطمئن نہیں ہے ???

مطالب و مفاہیم کا وہ موجودہ بلند پہاڑ،،،اور وہ تمام تر نابغہ شخصیات،،، جنہوں نے یہ پہاڑ بتدریج تعمیر کرتے ہوئے "حدود فراموشی" کا کارنامہ سر انجام دیاہے، ہمارے اس آج کے جدید مفسر کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ سب کو کالعدم قرار دیتاہے اور صرف خود ہی کو جدید دور کا نجات دہندہ باور کرتا ہے ??? اور اُسی "حدود فراموشی" کی منزل کو طوعاو کرہاطے کر رہاہے !!! (دیکھیے راقم الحروف کا آرٹیکل "تحقیقِ تفاسیر قرآنی-تفسیر نویسی ایک فن یاحدود فراموشی کا جرم")۔

وہ اور ہم سب ، دانستہ یا نادانستہ، یہی باور کرتے ہیں نا کہ ،،،،،،قرآن "آسان نہیں" بلکہ اس قدر" مشکل" ہے کہ تفاسیر و تشریحات وتراجم کے ایک کوہِ گراں کے باوجود آج تک قرآن سمجھا ہی نہیں جاسکا???

پھر کیوں ہم مشکلات کے ایک ڈیڑھ ہزار سالہ کٹھن دور کو پیش نظر رکھنے کے باوجود بھی یہ مانتے ہیں کہ "قرآن سمجھنے کے لیے آسان کر دیا گیاہے"???

آخر یہ کیسی تضاد سے لبریز" آسانی" ہے جس سے وابستہ "مشکلات" ڈیڑھ ہزار سال بعد بھی حل نہیں ہو سکیں ???? آخر اس "آسان مواد" کو ہم کیوں نہیں سمجھ پاتے اور اس پر اتفاقِ عمومی پیدا کر کے اس قدیمی جھگڑے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے ???

آخر ہم ایسے کس انوکھے دورِ ظلمات کی پیداوار ہیں کہ جس کے اندھیاروں سے ہمیں ایسی شدید محبت ہے کہ ہم نسلوں بعد بھی عقل و دانش کی روشنی کی ایک کرن بھی اپنی قدیمی حدود میں داخل ہونا برداشت نہیں کر سکتے ???

اور "میں نہ مانوں" کی ایک دفاعی سٹریٹیجی یا ڈھال بھی ہم نے ایجاد کرلی ہے جس کی آڑ میں علم و عرفان و آگہی کے سارے حملوں سے اپنا"تحفظ" یقینی کرلیاہے ????

ان اندھیروں کو برقرار رکھنے کی خاطر ہم نے جان کی بازی لگائی ہوئی ہے۔۔۔ کیوں؟؟؟ شاید اس لیے میرے دوستو، کہ روشنی ہم پر ہمارے بھیانک چہرے آشکار کر دے گی! اور ساتھ ہی ساتھ ان بھیانک چہروں کے پیچھے چھپی ہماری خوفناک حیوانی جبلتیں، جو ہماری خدائی شعوری اقدار پر تسلط قائم کیے ہوئے ہیں، آشکار ہو کر خود ہمارے اور دنیا کے سامنے آ جائیں گی۔ ؟؟؟؟؟؟

اب آیئے اُس آیتِ مبارکہ کی جانب جس کا ہم نے صدیوں سے حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ مضمون کی دوسری قسط کے بعد (یہ مضمون اقساط میں فیس بک پر پوسٹ کیا گیا تھا) کئی دوستوں نے از خود یہ آیت بمعہ،،،، ایک عدد قدیمی فرسودہ ترجمہ ،،،،، حوالہ زد کی ہے جو، ظاہر ہے، کہ ہمارے سابقہ عقلی و منطقی دلائل کے مقابلے میں ایک تضاد کو ظاہر کرتی ہے۔ آیتِ مبارکہ:-

وہ آیتِ مبارکہ ہے " وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ "۔ قرآن میں تکرار کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

ہم اور ہمارے جملہ اساتذہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں:-

"اور ہم نے اس قرآن کو نصیحت لینے کے لیے آسان کر دیا ہے۔ بس ہے پھر کوئی جو اسے سمجھنے کا ارادہ کرے"۔ آخر یہ کیا دو عملی ہے؟ ایک طرف اتنا مشکل کہ آج تک اس کی فہم پر مباحثے، مناظرے، محاذ آرائیاں چل رہی ہیں، دوسری طرف ہم اسی ترجمے کو صحیح ماننے کے لیے لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں جو اسے "آسان" قرار دے رہا ہے،،،،،،،،، اور اس طرح ایک بڑے تضاد کی نشاندہی کر رہا ہے۔؟ ہمیں یہ تضاد کیوں قبول ہے؟ کہیں ہماری اندرونی ذات ہی تضادات کی عادی تو نہیں ہو چکی؟

تضاد کا ایک اور بڑا اور مستند پہلو قرآن کے وہ متعدد ارشاداتِ عالیہ بھی ہیں جو،،،، اس ترجمے کی ضد میں،،،،، کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو صرف مختص ہے علم والی قوم کے لیے،،، غور فکر و تدبر والی قوم کے لیے، تحقیق و جستجو کرنے والے گروہ کے لیے، اصحابِ دانش کے لیے۔ یہ ارشاداتِ عالیہ برملا اعلان کرتے ہیں کہ بہت ہی قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہو گی جو اس کا فہم جان سکیں گے!!!

تو پھر کیا قرآن تضادات کا مجموعہ ہے؟؟؟ ایک طرف تو آسان ہے،،،،، دوسری طرف نہ ہی آسان ثابت ہوا ہے،،،،، نہ ہی ہر ہما شما کے بس کی بات ہے؟؟؟

لیکن، اس کے باوجود، قرآن کہتا ہے کہ "لوکان من عند غیر اللہ لوجدو فیہ اختلافا کثیرا" ۔ کہ۔۔۔۔۔" قرآن میں تو تب ضرور کثیر تعداد میں تضادات ہوتے اگر یہ غیر اللہ کی جانب سے آیا ہوتا"۔۔۔۔۔یعنی قرآن میں کوئی تضاد نہیں۔۔۔۔۔تو پھر جب وہ ایک جانب تو اپنی تفہیم کے لیے بلند علمی اور فکری درجات مقرر کرتا ہے، تو دوسری جانب کیسے اسے "آسان" قرار دے سکتا ہے۔؟

تو دوستو، قرآن تو بات کو متعدد بار دہرا کر یہ زور دے رہا ہے کہ: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ "۔ ہم نے تو اس قرآن کو "بسہولت و بافراط مہیا و میسر" کر دیا ہے اس لیے کہ اسے سمجھ کر نصیحت حاصل کی جائے ۔ تو پھر آؤ کون ہے جو وہ استعداد حاصل کرتا ہے کہ اس کا فہم و ادراک کر سکے"۔ یعنی یہ تو گویا ایک مشکل چیلنج دیا جارہا ہے ،،،،،،، تحصیلِ علم و عرفان کا وہ بلند و بالا درجہ ،،،، حاصل کرنے کے لیے جہاں قرآن کی حکمت کو سمجھا جا سکے۔۔۔۔۔"یسرنا" کا ترجمہ "ہم نے "فہم" کی آسانی کر دی ہے" ،،،،، کیوں ؟؟؟ کس حوالے اور کس اتھارٹی سے ؟؟؟۔۔۔۔۔ یہاں تو معنی "دستیابی" کی آسانی ہے، اس تک رسائی کی آسانی ہے، نسخوں کی فراوانی سے میسر آ جانے کی آسانی کا ذکر ہے۔ فہم آسان ہوتا تو آج امن ہی امن نہ ہوتا! ذرا "لین کی لغات" کا مطالعہ تو کر کے دیکھیں۔۔۔۔ی س ر abundance, richness کے معانی میں بھی آتا ہے۔ لیکن ہمیں تحقیق و مطالعہ پسند نہیں !!!

حالانکہ ،،،،، یہی وہ ترجمہ ہے جو قرآن کو اس موضوع پر تضادات سے پاک بھی کر دیتا ہے، یعنی اس کے سیاق و سباق میں عقلی طور پر فٹ بیٹھ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔"میں نہ مانوں" والی ذہنیت کے سدباب کیلیئے تو فوری طور پر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تو دوستو،،،، قرآن نہ آسان تھا،،،، نہ ہے،،،،، نہ مسلمان کہلانے والے کے لیے، اس کی قابلِ رحم علمی حالت کے سبب، کسی بھی قریبی مستقبل میں اسے پوری طرح سمجھنا آسان ہو گا۔۔۔۔ کوئی نہ کوئی آنے والا انسانوں کا گروہ اسے ضرور سمجھ لے گا، اُس وقت جب انسان اپنی تعمیر کی اس رہ گذر میں اور بہت سی منزلیں طے کر چکا ہو گا۔ . . تو آیئے قرآن پر لڑائی جھگڑا بند کر دیں۔ انسانی اور آفاقی علوم کی تحصیل میں جُٹ جائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے آج ہم نہیں، تو کل ہماری آنیوالی نسلیں علم کی اُس منزل پر ضرور پہنچ جائیں گی جہاں ہماری شعوری ذات کے نہاں خانوں میں مردہ پڑا ہوا بھائی چارہ، اشتراکِ عمل اور باہمی افہام و تفہیم کا وہ جذبہ بھرپور انداز میں زندہ ہو جائیگا، جو ہمارے ارتقاء کا سفر آسان کرنے کے لیے خالق نے ہر ذی روح میں ودیعت کیا ہوا ہے۔

اور جہاں پہنچنے پر ہم قرآن کا ایک متفقہ فہم حاصل کرنے کے لائق ہو جائیں گے۔

ہماری شعوری ذات کے اندر ثبت قرآن

چھوڑ دیجیئے قرآن کو،،،، اگر آپ کا اس کے مفاہیم یا معانی پر لاکھ کوشش کے باوجود اتفاقِ رائے نہیں ہو پاتا۔۔۔۔ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر ابھی ہمیں یہ ادراک حاصل نہیں ہوا، یا تہذیب کا وہ قرینہ ہمارے قریب سے نہیں گذرا، کہ دینیات کے میدان میں جھوٹ کی دکان اور سچ کی میزان میں فرق کو پرکھ سکیں،،،، تو اس میدان کو اپنی روزمرہ کی زندگیوں سے الگ چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایک فول پروف سسٹم بنا کر انسانوں پر لاگو کیا ہوا ہے۔ اور اس کے ذریعے ہدایت ہر ایک کے لیے ہر آن و ہر ساعت موجود ہے۔ یہ ہدایت ہر انسان کے ضمیر کے اندر سے نکلتی ہے۔ اس سے اجتماعی خیر کے کام انجام دلاتی اور اس طریقے سے اسے جستہ جستہ ارتقاء کی راہ پر گامزن رکھتی ہے۔ اگرچہ کہ سفر ارتقاء نہایت طویل ہے۔ اور انسانوں کی اکثریت ابھی اپنی خود شناسی میں ادھورا رہ جانے کے سبب اُس اندرونی ضابطِ اخلاق کی مکمل شناخت اور متابعت میں کافی سُستی اور لاپرواہی سے رُوبہ عمل ہے۔

کیا اس ذاتِ عالی مقام کو علم نہ تھا کہ قرآن کو صرف وہ گروہ ہی مانے گا، جو محمد رسول اللہ پر یقین رکھتا ہو گا۔ دوسرا گروہ جو انسانوں کی تین چوتھائی تعداد پر مشتمل ہے، جس کے لیے قرآن کوئی اہمیت نہیں رکھتا، آخر وہ کیسے ہدایت پائے گا۔ اور ایک سب سے بڑا گروہ تو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں، دونوں کا، اس کیفیت کا مالک ہے جو صحائف کو صرف زبانی مانتا ہے۔ بوجوہ سمجھ نہیں پاتا ۔۔۔۔ عمل کرنے میں بھی یقین نہیں رکھتا۔ حیوانی ضروریاتِ زندگی کی دوڑ میں مستغرق رہتا ہے۔ ۔۔۔ دوسرا گروہ ایسا بھی ہے جو کسی بھی صحیفے کو یا آسمانی رابطے کو صرف خیالی مانتا ہے۔۔۔۔ یہ دونوں گروہ اخلاق و کردار کی راہنمائی کہاں سے حاصل کریں گے ؟؟

لیکن اللہ تعالیٰ تو اپنی ساری مخلوق کی نشوونما و ہدایت کا ذمہ دار ہے۔ وہ تو بچے کے لیے، اس سے قبل کہ وہ پیدا ہو، اس کی ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی فراہمی تیار رکھتا ہے۔ پس کیا اسی کی مانند وہ اس کی روحانی خوراک یا ہدایت کا بھی اس کی پیدائش سے قبل ہی انتظام نہیں کر دیتا ہو گا؟۔۔۔ سب انسانوں کے لیے،،،، بلا استثناء؟؟۔

لہذا اس نے دو قسم کی ہدایت کے طریقے پلان کیے ہیں اور ہمیں اس پر مطلع بھی کر دیا ہے۔ ایک وہ طریقہ جو موروثی طور پر اس ذاتِ پاک کی اپنی خدائی خصوصیات یا اوصاف کو انسانی شعور کے اندر ثبت کر دیتا ہے۔ جو غیر مادی و غیر مرئی ہے۔ دوسرا طریقہ وہ مادی پیکرِ تحریر ہے، جو چند انتہائی ارتقاء یافتہ مخصوص انسانوں کے ذریعے نازل کیا جاتا ہے۔ جو قرآن اور دیگر صحائف پر مشتمل ہے۔

اُسے وہ خالق ومالک "تذکرۃ" کہ کر بار بار پکارتا ہے۔ یعنی یاد دہانی! کس چیز کی یاد دہانی،،،،،؟ اسی خزینہِ اقدار و اوصاف کی جو وہ پیدائش سے قبل ہی انسان کے اندر ودیعت کر دیتا ہے، اور جسے وہ "اپنی روح" کہتا ہے (فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ – 29/15)۔ اور جس سے انسان صرف ایک حیوانی پیکر نہیں رہ جاتا بلکہ ایک "چیزے دیگر" (ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّـهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ – 14/23) بن جاتا ہے۔ اس خزینے کی عطاء میں نسل، مذہب، قوم، رنگ و روپ، تعلیم یافتہ اور پسماندہ، کسی بھی بنیاد پر وہ خالق ومالک کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔۔۔۔۔۔!!! دیکھیے وہ اس دوسرے طریقے کو جو مادی پیکرِ تحریر رکھتا ہے کیسے اس اولین طریقے کی "یاد دہانی" (تذکرۃ) کہ کر ان دونوں طریقوں کا اثبات فرماتا ہے:-

إِنَّ هَـٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (19/73)

كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ (٥٤) فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ (54/74)

إِنَّ هَـٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (29/76)

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (١١) فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ (١٢) فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ (١٣) مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (١٤) بِأَيْدِي سَفَرَةٍ (١٥) كِرَامٍ بَرَرَةٍ (11/80)

اور اُسی اولین طریقہِ ودیعت کی وہ یہ تشریح بھی روشنی میں لے آتا ہے کہ خود انسان ہی کے اندر اس کی شکست وریخت اور اس کی ارتقاء کے عناصر، اس کے نفس کی ہیئتِ ترکیبی ہی میں، موروثی طور پر رکھ دیے گئے ہیں۔(وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا – 8/91)۔

ہم لوگ تو نفسِ امارہ کی مار کھائے ہوئے وہ لوگ ہیں جو قرآن اور دین کے معاملات میں اپنی اپنی اناؤں کا ایک دنگل لڑ رہے ہیں۔ اس دنگل میں ہمارا پورا ارتکاز ایک دوسرے کو مختلف داؤ مارنے تک ہی محدود ہے۔ آیئے ایک انتہائی خود آگاہ دانشور کے چشم کشا الفاظ کے ساتھ اپنا قرآن اور نماز سے شروع کیا گیا یہ مقالہ اس کے اختتام کو پہنچا دیتے ہیں۔ توجہ سے پڑھنے کی درخواست ہے:-

"۔۔۔ مگر زندگی دنگل کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ ہی سب کچھ ہے۔ وہ دانش، دلیل، محبت اور برہان کی ایک مباحثہ گاہ ہے جہاں قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں انسانوں کے حال اور مستقبل کے سب سے زیادہ مہم اور اہم قضیوں کو طے کیا جاتا ہے۔ یہ دور دنگلوں اور "میدان داریوں" کا دور نہیں ہے۔ یہ تفکر اور تدبر کا دور ہے۔ اس دور کا ہم سے جو سب سے زیادہ توجہ طلب تقاضا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بائستہ وجود، شائستہ بقا اور اپنے ہمہ جہت ارتقاء کے وسط اور گردوپیش سے آگاہی حاصل کریں۔ ہم فاقہ کش اور فلاکت زدہ ڈھور ڈنگر ہیں۔ ہم جہل اور جنگلی پن کا ایک بے ڈھنگا ریوڑ ہیں۔ ہماری آبادی کے سب سے بڑے

گلے کو کسی طرح بھی "حیوان ناطق" کے خانے میں مندرج نہیں کیا جا سکتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ "نیم انسان" ہیں۔ جان لیا جائے کہ میں یعنی جون ایلیا کسی بھی نسلی، لسانی اور مذہبی گروہ کی خوشنودی کمانے کی خاطر بیہودہ نگاری اور قلم دوات اور کاغذ کی فحاشی کا مجرم قرار پانے کے لیے اپنی آخری سانس تک تیار نہیں ہوں گا۔ سنا جائے اور سمجھا جائے کہ "جون ایلیاؤں" کو دو وقت کی روٹی چاہیے۔ انہیں تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے چاہئیں۔ ان کے بیمار ڈھانچوں اور ڈھچروں کو دوائیں چاہئیں۔ ان ڈھور ڈنگروں کو کسی نہ کسی حد تک انسان کہلائے جانے کے لیے حرفوں کی شد بد چاہیئے۔ یہ ذہن کی جولانی، جہد اور اجتہاد کا دور ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو ماننے میں الکساہٹ سے کام لے رہے ہیں، انہیں اپنے جسد کے لیے کافور اور کفن کا بندوبست کر لینا چاہیے"۔

------ -

اور اب آخر میں، قرآن کے عنوان سے لکھے گئے اس مقالے پر جناب استاد عباس اظہر صاحب کی تشویش پر اس ناچیز کا جواب، جس کو قدرے وسیع کر دیا گیا ہے:

""""ناچیز کو جناب نے علمی انداز میں مخاطب فرمایا، نہایت ہی عزت افزائی فرمائی۔ مشکور ہوں۔
------ سر، میرے جیسے ناچیز کا موقف بالکل واضح ہے۔ کتابِ ہستی اور کتاب تخلیق کا سبق جب تک احاطہ نہیں کیا جائیگا، کتابِ ہدایت (قرآن) کا فہم و ادراک نہ ہو پائے گا۔ ------ جھگڑے، فساد، لعن طعن، دلیل اور ردّ دلیل جاری رہیگی۔ دیکھیے وہ مالک بھی یہی سبق احاطہ کرنے کے لیے کہتا ہے،،، اور انہی کو اولی الباب کہتا ہے جو یہی سبق پہلے ازبر کر لیتے ہیں پھر اللہ کی صفات کی یاددہانی اور ان کو پیشِ نظر رکھ کر نصیحت حاصل کرتے ہیں:-

/191 : إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (١٩٠) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّـهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَـٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

ترجمہ: "درحقیقت تخلیقِ کائنات میں اور روز و شب کی گردشوں میں اصحابِ دانش و بینش کے لیے نشانیاں ثبت ہیں۔ یہ اصحابِ دانش و بینش وہ ہیں جو اپنا موقف اختیار کرنے میں، اس سے پیچھے ہٹنے میں، اور زندگی کے تمام پہلوؤں کو حیطۂ فہم و ادراک میں لانے کے عمل میں، اللہ کی صفاتِ عالیہ اور اس کے اٹل قوانین کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، اور اسی انداز میں تخلیقِ کائنات پر غور و فکر کرتے ہوئے اقرار کرتے ہیں، کہ اے ہمارے پالنہار، تو نے یہ عظیم کارخانۂ حیات عظیم مقاصد کے تحت تخلیق فرمایا ہے۔ کیونکہ تُو بلند و

بے عیب ذات کا مالک ہے۔ پس ہم سب کو مجموعی طور پر محرومیوں اور پچھتاوں کی اس آگ میں جلنے سے بچالے جو اِس حقیقت کا انکار کرنے والوں کیلیے مقدر ہو چکی ہے۔"

اس موقف سے اختلاف کا حق سبھی قارئین کے لیے محفوظ ہے۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ کیا آج کے دن،،، اور تحریر کی اس موجودہ ساعت تک،،، کیا قرآن کے اب تک کے فہم کی تحصیل نے کہیں بھی انسانوں میں کوئی اتفاقِ رائے پیدا کیا ہے؟۔۔۔۔ جواب ہے، نہیں۔ کیا کہیں بھی اس کی تعلیمات کو عمل پذیر کیا جاسکا ہے؟۔۔۔۔۔ جواب ہے، نہیں۔ کیا اس پر جاری بحث مباحثے اور دلائل و رد دلائل میں کہیں کوئی کمی دیکھنے میں آئی ہے؟۔۔۔۔ جواب ہے، نہیں۔۔۔۔ پس زمینی حقائق کے مطابق یہ ایک کارِ لا حاصل ثابت ہو چکا ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال کی خوں ریزیاں اور سلب و نہب اس بات پر شاہد ہیں کہ ہم نہ اسے سمجھنے کے قابل ہو سکے ہیں اور نہ ہی سمجھانے کے۔ اور نہ ہی اس کی تعلیمات کا اطلاق کرنے کے۔

خاص اسی نکتے کی توثیق کے لیے خود خالق نے اپنی کتاب کا فہم مشروط کیا ہے۔ بے شمار آیات موجود ہیں جو اس کتاب کا تحصیلِ علم مخصوص انسانوں کے لیے مختص کرتی ہیں۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہو گا۔

حوالے دیے بغیر مختصراً قرآن کے الفاظ پیش کر دیتا ہوں، جو فرماتا ہے کہ یہ کتاب اور اس کا فہم ان کے لیے ہے جو: لقوم یعلمون، لقوم یتدبرون، لقوم یتفکرون، لقوم یفقھون، لاولی الباب، وغیرہ میں سے ہوں۔

میری کیا مجال کہ قرآن پڑھنے والوں پر قدغنیں لگاؤں۔ اگر کہیں قدغنیں لگی ہیں تو کتاب کے خالق ہی کی جانب سے ہیں۔ پھر اس کا چیلنج بھی یہی توثیق کرتا ہے کہ یہ ہر ہما شما کے بس کی بات نہیں: "ھل من مدکر" ؟ "ہے کوئی جو اسے سمجھنے کا فریضہ / بارِ گراں اٹھانے کی ہمت کرے"۔ چیلنج کا انداز انہی الفاظ میں ترجمے کا تقاضا کرتا ہے۔

سر، میں ہمیشہ وکالت اور سفارش کرتا ہوں کہ اصل کرنے کا کام ہے اسلامی مملکتوں کے لیے۔ وہ ایک بین الاقوامی سکالرز کا پینل قائم کریں۔ انہیں وافر وسائل مہیا کر دیں۔ ان کی اہلیت، دانش، مطالعے کی وسعت، تجربے اور متنوع علوم کے احاطے کا ایک معیار مقرر کر دیا جائے۔ اور پھر یہ اتھارٹی صرف انہیں ہی سونپ دی جائے کہ باہمی اتفاق رائے سے ایک موقر اور مستند ترجمہِ قرآن تیار کر کے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اس کو بلا حجت عالم اسلام میں تسلیم کیا جائے۔ کوئی بھی اضافہ، ترمیم، ارتقاء سب اسی اتھارٹی کے

اختیار میں ہو۔ علمی اعتراضات بھی اتھارٹی کو پیش کیے جائیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے کہ بات کچھ بن سکتی ہے۔ اور یہ کام ہونے تک ہم سب قرآن کا پیچھا چھوڑ دیں۔ کیونکہ ہم اب تک صرف اس کے مقصد کو نقصان پہنچانے کا کام کرتے رہے ہیں۔

یہ حقیقت ہے سر، کہ قرآن کے بغیر بھی دنیا میں بہت سے خیر کے کام چل رہے ہیں، اور ان کا ماخذ و منبع انسان کی وہ اندرونی شعوری ذات ہے جو اپنے خالق کا عکس اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ اور خالق کی صفات اسے وہی کام کرنے پر ابھارتی ہیں جو خالق کی ذات کا خاصہ ہیں۔ سر، قرآن تو انسان کو ودیعت کردہ اس مخزونہِ علم کی ایک مادی شکل میں یاد دہانی (تذکرۃ) کا درجہ رکھتا ہے۔ اقبال نے بہت خوبصورتی سے اُس خاص ودیعت کو اپنے بہت سے اشعار میں پیش کر دیا ہے۔ کتابِ ہستی میں جستجو کرنے والوں کے لیے بات بہت واضح ہے۔ مثلاً:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — الفاظ میں کردار میں، اللہ کی برھان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
یہ غازی، یہ ترے پر اسرار بندے — جنہیں بخشا ہے تُو نے ذوقِ خدائی
ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کار کشا و کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
تُو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

والسلام۔""""

ختم شد۔